۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء

ہفتہ وار

# ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۳۹

## اس شمارے میں



آل احمد سرور

# میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟

(۱۵)

امریکہ کی جو یونی ورسٹیاں میں نے دیکھیں ان میں طلبہ کے اپنے اخبار مجھے بہت پسند آئے۔ یہ اخبار اتنے اچھے ہوتے ہیں، ان میں یونی ورسٹی کی سرگرمیوں کے متعلق اتنی معلومات ہوتی ہیں اور ان میں ملک کے اہم واقعات، یونی ورسٹیوں کی اہم شخصیتوں، طلبہ کی جماعتوں اور ان کے اہم مطالبات کے متعلق ایسے مضامین ہوتے ہیں کہ انھیں طالب علم اور استاد بھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ مثلاً کولمبیا یونی ورسٹی سے طلبہ (MAROON) نکالتے ہیں یہ ہفتے میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ یونی ورسٹی اس پرچے کو امداد دیتی ہے اور کبھی کبھار یونیورسٹی کی طرف سے مواد بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ مثلاً صدر (وائس چانسلر) کی رپورٹ، یونی ورسٹی کا بجٹ، یونی ورسٹی میں نئے تقررات کے متعلق اطلاعات۔ مگر اس کے باوجود اخبار میں طلبہ کے نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین ہوتے ہیں، بلکہ استادوں، نصاب یا کسی خاص کورس کے متعلق آزادانہ اظہار خیال بھی ہوتا ہے جس میں لگی لپٹی نہیں رکھی جاتی۔ میں نے خود دیکھا کہ منگل اور جمعہ کو اخبار (MARK DVN) کی گڈیاں مختلف عمارتوں کے برآمدے میں رکھ دی جاتی تھیں اور عام طور پر ہر طالب علم یا استاد جو ادھر سے گزرتا تھا، ایک کاپی لے لیتا تھا۔ استادوں اور طالب علموں کو یہ اخبار مفت ملتا ہے، باہر والوں کے لئے اس کا چندہ مقرر ہے۔ اس اخبار میں نئی فلموں، نئے ڈراموں، نئی کتابوں پر جو تبصرے ہوتے ہیں وہ خاصے معیاری ہوتے ہیں۔ طلبہ جو مظاہرے کرتے ہیں ان کے متعلق بھی ساری معلومات اخبار میں درج ہوتی ہیں۔ چونکہ شکاگو یونی ورسٹی بہت بڑی ہے اور روز وہاں درجنوں اچھے پروگرام کسی نہ کسی شعبے میں ہوتے رہتے ہیں، اس لئے ان کا علم اس اخبار سے ہو سکتا ہے۔ سارے شعبوں کے نوٹس بورڈ پڑھنا ہر ایک کے لئے ممکن نہیں ہے کیونکہ نوٹس بورڈ پر زیادہ تر اس شعبے یا متعلقہ شعبے کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاع مل سکتی ہے۔ اس اخبار کے اشتہارات اور ذاتی کالم بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ کہیں یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ صدر نکسن کو اس مضمون کا تار دیا جائے، کہیں کسی مظاہرے میں شرکت کے لئے اپیل ہے، کہیں کسی تجربے کے لئے کسی استاد نے کچھ معمول طلب کئے ہیں، جنھیں معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ کہیں کوئی نوجوان کسی لڑکی سے کسی خیز رشتے

(MEANING FUL RELATION SHIP) قائم کرنے کے لئے نئے کی دعوت دیتا ہے۔ کہیں ٹائپ کرنے کے لئے مدد مانگی جا رہی ہے۔ میں نے وسکانسن یونی ورسٹی میں، منسوٹا یونی ورسٹی میں، ہارورڈ میں، ایبے ل (YALE) میں بھی طلبہ کے ایسے ہی اخبار دیکھے۔ اگر ہماری یونیورسٹیوں سے اس قسم کے اخبار نکلیں تو یقیناً ان کے ذریعہ سے طلبہ میں اپنے جذبات و خیالات کے سنجیدہ اظہار کے لئے صلاحیت پیدا ہوگی، طلبہ اور اساتذہ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، انہیں ایک تہذیبی سرگرمی کے ذریعہ سے اپنی شخصیت میں گہرائی پیدا کرنے کا موقع ملے گا، کچھ طلبہ کو اس طرح کام ملے گا اور ان کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور طلبہ اور اساتذہ اپنے علاقے کے شہریوں پر بھی اپنے خیالات واضح کر سکیں گے اور شہر اور یونی ورسٹی میں ایک رابطہ قائم ہوگا۔ اساتذہ اور طلبہ میں ایسے رابطے اور دونوں کے شہریوں سے رابطے کی آج ہمارے ملک میں بڑی ضرورت ہے۔ نہ صرف اس طرح نئی نسل کے خیالات عام شہریوں کے سامنے آئیں گے، بلکہ طلبہ کو کچھ ذمہ داری کے کام کرنے کا تجربہ ہوگا۔

دوسری چیز جو ان یونی ورسٹیوں میں خاص اہمیت کی مالک ہے وہ طلبہ کی یونین ہے، جس کی عام طور پر خاصی شاندار عمارت ہوتی ہے جس میں وزٹروں کی رہائش کے لئے بھی انتظام ہوتا ہے اور کھانے پینے کے لئے بھی۔ عام طور پر یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ، یونین کے ریسٹوران میں جا کر لنچ کھاتے ہیں۔ دوستوں اور مہمانوں کو بھی یہیں مدعو کیا جاتا ہے۔ اساتذہ کے علیحدہ کلب بھی ہیں، مگر طلبہ کے کلب کی عمارت میں بھی وہ برابر کسی نہ کسی تقریب کے سلسلے میں یا لنچ کے لئے جاتے ہیں۔ اس طرح طلبہ اور اساتذہ میں خاصا ربط قائم ہو جاتا ہے۔ اس یونین کی عمارت میں عام طور پر ایسے بڑے یا چھوٹے کمرے ہوتے ہیں جن میں مختلف قسم کے جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ میڈیسن (وسکانسن) میں میرا غالب کی عظمت پر لکچر یونین کی عمارت میں تھا۔ اسی طرح منسوٹا یونی ورسٹی میں مجھے ڈنر دیا گیا تھا وہ وہاں کی یونین میں تھا۔ گویا ان یونی ورسٹیوں میں یونین کی عمارت صرف طلبہ کا مرکز نہیں ہے، بلکہ یونی ورسٹی کی زندگی میں ایک مرکزی اہمیت رکھتی ہے، ہر یونین عام طور پر خاصی مالدار ہوتی ہے۔ وہ برابر طلبہ کی دلچسپی کے لئے مختلف قسم کے پروگرام چلاتی رہتی ہے، صرف احتجاجی کارروائی یا مظاہرے کے لئے نہیں ہوتی۔ ہماری سب یونی ورسٹیوں میں بھی اگر یونین کو تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے، اس کی عمارت میں اساتذہ اور طلبہ کے لئے ریسٹوران میں دوپہر کے کھانے یا کافی کا مناسب انتظام ہو، وہیں سے طلبہ کا اخبار شائع ہو، وہیں مختلف قسم کی دلچسپیوں مثلاً اندرونی کھیلوں، ریڈنگ روم کا انتظام ہو تو یقیناً یونین یونی ورسٹی کی زندگی میں زیادہ اہمیت اختیار کرے اور طلبہ کی توانائی کو زیادہ تعمیری کاموں میں لگایا جا سکے۔

امریکہ کی یونی ورسٹیوں کو دراصل استاد چلاتے ہیں اور ان کے چلانے میں طلبہ کا بھی خاصا حصہ ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یونی ورسٹی کی زندگی کے ہر شعبے میں استادوں کا اختیار ہونا چاہئے ہاں اس میں طلبہ کی رائے کو بھی دخل ہونا چاہئے۔ ہمارے بہت سے مسائل کا یہی صحیح حل ہے۔

---

# مشہور روسی ناولسٹ سول زے نٹ سن کو

# نوبل انعام

مشہور روسی ناولسٹ الیگزنڈر سول زے نٹ سن کو ۱۹۷۰ء کا ادب کا نوبل انعام دیا گیا ہے۔ سویڈن کی ادبی اکیڈمی نے کہا ہے کہ "یہ انعام اس دور کے دوستووسکی کو اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ اس نے روسی ادب کی ادبی روایات کو ایک اخلاقی طاقت کے ساتھ پیش کیا ہے"۔

سول زے نٹ سن ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی مر گیا تھا اور اس کی ماں نے اسے پالا۔ دوسری جنگ عظیم میں اس نے کئی موقعوں پر نام پیدا کیا اور لینن گراڈ کے محاذ پر بہادری دکھانے کی وجہ سے اسے پرائیویٹ سے کپتان بنا دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اسے قید کر دیا گیا کیونکہ اس نے اپنے دوست کو ایک خط میں اسٹالن پر نکتہ چینی کی تھی۔ اسے بغیر کسی مقدمے کے آٹھ سال کی سزا دی گئی تھی۔

اس کا ایک ہی ناول "ایوان ــ کی زندگی میں ایک دن" روس میں شائع ہو سکا۔ اس کے دو ناول کینسر وارڈ اور پہلا دائرہ (THE FIRST CIRCLE) کی طرح روس سے باہر چھپے اور اس وجہ سے اسے سوویت ادیبوں کی انجمن سے گذشتہ سال خارج کر دیا گیا تھا۔

بورس پاسترناک کو ۱۹۵۸ء میں یہ انعام ملا تھا مگر پاسترناک نے انکار کر دیا تھا۔ سول زے نٹ سن نے سویڈن کے ایک نامہ نگار کو بتایا کہ وہ کوشش کرے گا کہ وہ انعام لینے کے لئے سویڈن جائے۔ اب تک وہ روس سے باہر نہیں گیا ہے اور زیادہ تر تنہائی پسند آدمی ہے۔

(ٹائمس آف انڈیا)

محمد انصار اللہ

# دیوان غالب کا نو دریافت مخطوطہ

یکم اگست ۱۹۷۰ء کے ہماری زبان میں اس موضوع سے متعلق بحث کا آغاز کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ "مسئلہ پر علمی انداز سے غور کرنے کی ضرورت ہے" کیونکہ حقیقت تک پہنچنے کا واحد طریقہ یہی ہے۔ اس گزارش کے باوجود میرا جواب لکھنے والے نے ۲۲ اگست کے "ہماری زبان" میں جو انداز اختیار کیا اس سے مجھے رنج ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص سے یہ توقع بیجا ہے کہ وہ محض اس لئے کہ ہم "محظوظ" ہوتے رہیں اپنے "مطالعہ کے نتائج شائع کرتا رہے گا"۔

۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان" میں میرے مراسلے کی اشاعت کے بعد جن بزرگوں اور دوستوں نے مخدوم مکرم پروفیسر آل احمد سرور کی خدمت میں خطوط لکھے ان میں سے چند ہماری زبان میں شائع کئے گئے اکثر حضرات نے براہ راست خط لکھ کر بھی میری ہمت افزائی کی میں ان سب کا نہایت شکر گزار ہوں بالخصوص بزرگ محترم پروفیسر نور الحسن ہاشمی کا کہ موصوف نے فرمایا "ہماری زبان کے شمارہ ۳۵ مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء میں آپ نے مکمل طور پر دیوان غالب (نسخۂ عرشی زادہ) کا جو طلسم توڑ دیا ہے وہ لائق صد ستائش ہے دیکھنا یہ ہے کہ اب اس کی تائید کرنے والے اس کا کیا جواب دیتے ہیں":

ہزاروں تحریروں کا نگاہ سے گذر جانا ان کو مختلف مقامات پر پیوند کر دینا کسی کے لئے فخر کی بات ہو تو ہو لیکن علمی نقطۂ نظر سے جو بات اہم اور قابل قدر ہو سکتی ہے یہ ہے کہ تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے، ان سے علمی نتائج اخذ کئے جائیں اور اگر ممکن ہو تو کچھ اصول و ضوابط بھی مستنبط کئے جائیں اسی طرح کتابوں کے انبار میں رہ کر ایک عمر صرف کر دینا قابل ذکر بات بھی کہ اس سے کبھی کبھی دوسروں کے لئے عبرت کا سامان بھی ہوتا ہے لیکن محض اتنی بات سے کوئی شخص دانشمند یا محقق نہیں ہو جاتا ایسے "بقول خود" محقق کے قول پر اعتماد کے نتیجہ میں اگر کبھی گمراہی کی صورت ہو تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ تحقیق کے لئے لازم ہے کہ موضوع پر تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر خواہ وہ وطنیت کے ہوں، ولدیت (نسب) کے ہوں یا ملکیت کے، غور و فکر کیا جائے، ذات یا شخصیت تحقیق کی راہ کا سب سے بڑا "روڑا" ہے لیکن تلخ اور افسوسناک سہی، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں موضوع پر ذات کو اکثر ترجیح دی گئی ہے بڑے بڑے دعوے کرنا ہمارے لئے معمولی بات ہے لیکن عموماً ان دعووں میں حقیقت کا عنصر بس اتنا ہوتا ہے جتنا آٹے میں نمک۔ اس حقیقت کا اندازہ سطور ذیل سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

اپریل فول نمبر ا "ماڈل ہائی اسکول بھوپال کے پرچے رگو ہر تعلیم" مطابق اپریل ۱۹۳۷ء میں "اپریل فول" کے عنوان سے ایک غزل شائع ہوئی" جس کا مقطع یہ تھا۔

ہیرا دمال غالب بیکس کر چکا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

لیکن اس غزل کے "خالق" غالب بیکس" کے بجائے مولوی محمد ابراہیم خلیل صاحب مرحوم تھے" اس غزل کو اس عنوان کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ بھوپال میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے قیام کا ثبوت بھی موجود نہیں ایک سے زاید لوگوں نے مرزا کا نایاب کلام تسلیم کر کے شائع کیا، ایک "ماہر غالبیات" نے اسے دیوان غالب میں بھی جگہ دی بالآخر یہ طے ہوا کہ

"یہ غزل نکال دی جائے۔ اس کے شائع کرنے والے نے اپنے جعل[1] کا اقرار کر لیا ہے"

[1] اس بابت ڈاکٹر ابو محمد سحر نے یہ لکھا ہے کہ (باقی نوٹ صفحہ ۹ پر)

---

مظفر حنفی

## غزل

سوچ نئی ہے، لہجہ تیکھا، لفظ کھرے، آواز جدا
دانستہ رکھتا ہوں اپنے شعروں کا انداز جدا

جب پیڑ بلندی پر پہنچی تو کھو دے گی اپنی پہچان
اونچا اڑنے سے بہتر ہے یہ تو بھی پرواز جدا

کان کھلے رکھو تو چڑھا ہوں پر بھی سن لوگے
آوازوں کے اس جنگل میں خاموشی کا ساز جدا

سانسیں لیتی چلتی پھرتی لاشوں کو احساس کہاں
مرنے کے آداب الگ ہیں جینے کا ہے راز جدا

ہر کھوں کی دشتوں پر آنکھیں رکھنے والے کیا جانے
جذبے کی تاثیر جدا ہے لفظوں کا اعجاز جدا

اس سلسلہ میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے کہا ہے کہ

"اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اردو تحقیق کا سب
سے عبرت انگیز واقعہ کیا ہے تو میں کہوں گا کہ
دیوان غالب میں اس غزل کی شمولیت"

(ہماری زبان مورخہ ۸ر جنوری ۱۹۶۹ء)

نمبر ۲۔ لیکن ڈاکٹر سحر نے اس فیصلہ میں ذرا عجلت سے کام لیا اس لئے کہ "سب سے عبرت انگیز واقعہ" تو واقعۂ مذکور کے کامل بتیس سال کے بعد ظہور میں آیا اور اس شان کے ساتھ ظہور میں آیا کہ پوری اردو دنیا (بہ شمول ڈاکٹر صاحب موصوف) اس کی لپیٹ میں آگئی، غالب کے دیوان کے ایک قلمی نسخہ کا اسی بھوپال سے اور اسی اپریل کے مہینہ میں "غالب صدی" کے موقع پر "خروج" ہوا کہا گیا کہ یہ "بخط غالب" ہے۔ باوجود اس کے کہ اس میں ایک سے زاید ساے کی باتیں ایسی دیکھی جاسکتی تھیں جو اس پر شک پیدا کرتی تھیں بلاوری اردو دنیا نے متفق اللسان ہوکر اس پر آمنا صدقنا کہا؛ یا تو کسی کو اس کی حقیقت پر شک ہی نہ ہوا یا شک کا اظہار کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ راقم سطور کو یہ جرات نہیں کہ وہ کسی کی جرات پر شک کرے اس لئے اغلب ہے کہ پہلی ہی صورت رہی ہوگی۔

مخدوم مکرم پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی عنایت سے جولائی ۱۹۷۰ء میں اس دیوان کا عکس دیکھنے کے لئے راقم سطور کو ملا، دیکھا اور نہایت حیرت سے دیکھا، اس ابتدائی مرحلے پر کوئی قطعی بات کہنا مناسب نہ تھا، یوں بھی اچھا یہی معلوم ہوا کہ اپنے بزرگوں اور دوستوں کی رائے پہلے معلوم کرلوں اس لئے چند بدیہی لیکن اہم امور ایک مضمون کی صورت میں قلمبند کئے[۴] اور اس مضمون کو یکم اگست ۱۹۷۰ء کے ہماری زبان میں شایع کیا، اسے عبرت انگیز واقعہ نہیں،

الیہ کہئے کہ اس عرض کے باوجود کہ:

"میری گزارش ہے کہ ان امور پر غور کرلیا جائے"

کسی ایک صاحب نے بھی مسئلہ پر کما حقہ، توجہ[۵] نہ کی اور توجہ کرتے بھی کیونکر، اس دیوان کا "بخط غالب" ہونا تو مسلّم ہوچکا تھا اور "مسلّمات" پر شک کرنا عام طور پر جائز نہیں۔ "میری گزارش" پر کہا گیا تو یہ کہا گیا کہ:

"ان اعتراضات کا پڑھنے والا انھیں خط شکست کی خصوصیات سے بھی نا آشنا قرار دے گا۔"

اور اتنی بات کہنے والا بھی دیوان مذکور کے عکس کو "جملہ حقوق کے ساتھ" ہندوستان میں شایع کرنے والے کے[۶] سوا کوئی اور نہ ہوا۔

**نسخہ کا خروج:-**

دیوان غالب کے اس نسخہ کا جس نے دنیائے ادب میں غیر معمولی سرعت کے ساتھ شہرت حاصل کی بھوپال میں "خروج" ہوا۔ اس مسئلہ پر بحث رہی ہے کہ اس کی "دریافت" کا سہرا کس کے سر ہے۔ بہر حال قاضی شفیق الحسن خاں نقلی پہلے شخص ہیں جو اس نسخے کو اپنی "ملک" تسلیم کرتے ہیں کہا گیا ہے کہ قاری صاحب نے اسی کو "ابراہیم پورہ بھوپال کے ایک کباڑی حیدر شیر خاں عرف پٹھان کی دوکان سے ڈھائی روپے میں خریدا تھا" لیکن یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خود حیدر شیر خاں کو بھی "بالخصوص اس دیوان کے بارے میں یہ علم نہ تھا کہ قاری شفیق الحسن اسے انھیں کے یہاں سے لے گئے تھے"۔ قاری صاحب سے اس نسخے کی بابت ایک جملہ اور ایک تحریر منسوب کی گئی ہے جملہ یہ ہے جو مبینہ طور پر اس نسخے کو بیچتے وقت ادا کیا گیا:

"میاں کیا یاد کروگے تمہیں مرزا غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان دے رہا ہوں"

(ریاض غالب، النقوش لاہور، ص۹)

---

(باقی نوٹ ۳ کا) "مولوی ابراہیم خلیل مرحوم ۔۔۔ کے اقدام کو جعل کی کسی تعریف کے ماتحت جعل نہیں کہا جاسکتا" اپنی غلط فہمی کا اعتراف کرنے کے بجائے ان کی غزل کو جعل کہنا بجائے خود بہت صحیح بات نہیں اور بقول سحر صاحب "یہ جعل کی علت عرشی صاحب کو بھی موضوع زیر بحث میں مالک رام صاحب کے بہت قریب لے آئی ہے"

[۴] اس موقع پر مجھے اس غلطی کا اعتراف کرنا مناسب ہے کہ ترقیمہ کی عبارت میں جو ایک نہیں متعدد جگہوں پر چھپ چکی تھی "نقل ہوا" "عفی اللہ" کی جگہ "غفر اللہ" لکھو گیا تھا اور مذکورہ دیوان کے عکس کے ساتھ منسلک مقدمہ کی ایک عبارت نقل کرتے ہوئے میں نے "صحت نامہ" پر نظر نہ کی میرے مضمون کا جواب تحریر کرتے ہوئے "مقدمہ نگار" نے میری ان فروگذاشتوں پر بہت زور دے کر گرفت کی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر زیر بحث دیوان نہیں میری غلطیاں تھیں۔ (ملاحظہ ہو ہماری زبان، مورخہ ۲۲ر اگست ۱۹۷۰ء)

---

[۵] پروفیسر گیان چند نے البتہ ایک خط لکھ کر میری ہمت افزائی کی۔ اس میں موصوف نے فرمایا: "ہماری زبان میں آپ کا مضمون دیکھا۔ اچھا لکھا ہے مسلمات کے بارے میں آپ نے کچھ شبہات پیدا کردئے ہیں ۔۔۔ سب کچھ پڑھنے کے بعد بھی میری رائے میں یہ مخطوطہ غالب ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے خصوصی کاٹ کاٹ کر اصلاحوں کی نوعیت اور ترقیمہ یہی بتاتا ہے"

[۶] بھوپال کے سید حامد حسین صاحب اس سلسلے میں مستثنیٰ ہیں کہ انھوں نے میری "گزارش" کے بعد مسئلے پر غور کیا اور اپنے ایک شک کا اظہار بھی کیا۔

(ہماری زبان ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۰ء)

اور یادداشت یہ بتائی گئی ہے۔

"دیوان غالب قلمی محررہ ۱۸۲۵ء قلمی مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب مع مکتوبات فارسی غالب قلمی مبلغ گیارہ روپے میں حافظ توفیق احمد صاحب کو فروخت کی گئی۔"

(ہماری زبان مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۹ء)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک مخطوطہ "قصہ لیلیٰ مجنوں" کا بھی منسلک تھا۔

(بیاض غالب ص۱)

اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں (جن کی تصدیق کے لئے فی الوقت ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں) تو سوال یہ ہے کہ اس یادداشت میں ۱۸۲۵ء کا سال کہاں سے آگیا؟ یہ سال نہ مخطوطے پر درج ہے اور نہ اس نسخے سے بحث کرنے والے کسی مضمون نگار نے لکھا۔ دوسری بات یہ کہ "قصہ لیلیٰ مجنوں" کا بیرنسخہ کس کے ہاتھ کا اور کس زمانے و مقام کا لکھا ہوا تھا؟ اس نسخے کی تفصیلات اگر معلوم ہو جائیں تو شاید حقیقت تک پہنچنے میں زیادہ سہولت ہوتی۔ بہرحال اس موضوع سے متعلق اب تک جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس نسخے کا علم اردو دنیا کو اس وقت ہوا جب یہ ایک ایسے صاحب کی تحویل میں پہنچ چکا تھا جن کو بقول خود "ہندوستان کے تقریباً سب بڑے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور کتب خانوں سے واسطہ رہتا ہے" اور جو کم از کم گیارہ سال سے "قلمی و مطبوعہ کتب اور نادر اشیاء کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے ہیں۔" یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی شفیق الحسن صاحب کو اس نسخے سے کما حقہٗ مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بات بھی عام حالات میں خاصی طمانیت بخش ہو سکتی ہے کہ ہماری پیش کی ہوئی چیز کو "مسلمات" کا درجہ حاصل ہو جائے۔

مشہور ہے کہ

ع لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

یہ نسخہ بھی اپنا وطن چھوڑ کر "گوہر نایاب" اور "دُرِ بے بہا" تسلیم کیا گیا۔

ایک التماس :-

اسی زمانے میں جب کہ اس دیوان کے ہر طرف چرچے ہونے لگے تھے، نقاد اکبرآبادی صاحب کا ایک مراسلہ ۸ مئی ۱۹۶۹ء کے 'ہماری زبان' میں شائع ہوا۔ اس میں موصوف نے لکھا تھا:

"دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ مخطوطہ واقعی اصل ہے؟...... کسی ایک ماہر غالبیات کی رائے کو صحیح سمجھنا بھی بڑی بے انصافی ہوگی ..... ہو سکتا ہے کہ غالب کے کلام کا یہ مخطوطہ کسی تجربہ کار کاتب کا لکھا ہوا ہو اور غالب کی برسی کے موقع پر زمین سے نکالا گیا ہو .. بصد ادب التماس ہے کہ مخطوطے کی قیمت کا تعین سوچ سمجھ کر کریں"

اس "التماس" کے جواب میں تین مراسلے شائع ہوئے ان کے اہم تر اقتباسات درج ذیل ہیں:

"بغیر کسی مبالغے کے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ غالب کے قلم کی جتنی کثیر تعداد میں اصل تحریریں میں نے دیکھی اور استعمال کی ہیں وہ شاید ہی کسی دوسرے شخص کی نظر سے گزری ہوں یعنی ڈیڑھ ہزار سے بھی اوپر اردو، فارسی نظم و نثر کی تحریریں ...... اس لئے اگر غالب کے اس دیوان کے بارے میں یہ کہوں کہ یہ غالب کے اپنے قلم کا نقل کیا ہوا ہے تو اس دعوے میں میرا تجربہ شاید ہی مجھے دھوکا دے ...... زیر بحث نسخہ بھی نسخۂ حمیدیہ

---

سعادت نظیر

## غزل

ابھی گلوں میں کوئی جوششِ نمو تو نہیں
ابھی بہار پہ دنیائے رنگ و بو تو نہیں

برنگِ غنچہ ہوا چاک چاک دامنِ دل
کسی بھی چاک کو اب حاجتِ رفو تو نہیں

دھواں دھواں ہے ہر اک سانس سوزشِ غم سے
کہ دل میں آتشِ سیال ہے، لہو تو نہیں

یہ اور بات ہے، ہم دم سے حالِ زار کہوں
مجالِ عرض مگر تیرے روبرو تو نہیں

نجانے، عالمِ ہستی ہے کیوں حسین اتنا؟
یہ سوچتا ہوں کہ پردے میں اس کے تو تو نہیں

کہیں خلوص کی محفل نہ زندگی کا مقام
نہیں نہیں، یہ مرا شہرِ آرزو تو نہیں

خزاں پرست رہے جو بہار کے دشمن
دیارِ گل میں کوئی ان کی آبرو تو نہیں

اندھیری رات، کٹھن راستا، کڑی منزل
کوئی غریب کہیں گرمِ جستجو تو نہیں

زبانِ حال سے روداد غم سناتا ہوں
کرشمہ ہے یہ خموشی کا، گفتگو تو نہیں

کہیں یہ بادۂ گلگوں سے چھلکا چھلکا جہاں
نظیر، کارگہِ ساغر و سبو تو نہیں

اس کی طرح بھوپال سے ملا ہے گویا بھوپال کو غالب کے اردو کلام کو محفوظ رکھنے کا شرف دوبار حاصل ہوا۔"

(ہماری زبان مورخہ یکم جون ۱۹۶۹ء)

---

"جہاں بڑے بڑے جعل ساز اپنے ہنر کو بروئے کار لانے میں مصروف ہیں وہیں 'ہر فرعونے را موسیٰ' کے مصداق اللہ تعالیٰ نے ...... پرکھنے والے بھی پیدا کر رکھے ہیں ...... میں انھیں دعوت دیتا ہوں کہ نسخہ دیکھیے اور اپنے شکوک دور کرنے کے لیے جعل سازوں کی سرزمین امروہہ تشریف لائیں اگر نسخہ جعلی ہوا تو انھیں آمد و رفت کا کرایہ نذر کر دیا جائے گا۔" (ایضاً)

---

"جعل سازی کے امکانات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی اس لیے نقاد اکبرآبادی صاحب کا شبہ کرنا کچھ غیر متوقع بات نہیں ہے ...... خدا کے فضل سے اس گیارہ سال کے عرصے میں کوئی ایک مثال بھی میری جعل سازی یا بے ایمانی کی پیش نہیں کی جا سکتی۔"

(ہماری زبان مورخہ ۱۵ جون ۱۹۶۹ء)

پہلا اقتباس ان صاحب کا ہے جنھوں نے اس نسخے کا صفحہ بہ صفحہ عکس کتابی صورت میں ہندوستان میں شائع کیا، ان کا یہ فرمانا درست ہوگا کہ انھوں نے غالب کی سب سے زیادہ تحریریں دیکھی ہیں، لیکن اس دیوان کی بابت یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس کی ۱۲۳۱ھ میں کتابت ہوئی تھی اور اس سال کی یا اس کے چار پانچ سال بعد تک کی غالب کی کوئی تحریر ہنوز دریافت نہیں ہوئی ہے، زمانہ مابعد میں غالب کی تحریروں میں کوئی فرق پیدا ہوا یا نہیں، اس بابت فی الحال کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی پھر اگر کوئی فرق واقع ہوا ہو تو اس کی وسعت کیا ہو سکتی ہے یہ بھی طے کرنا آسان نہیں، ایسی صورت میں بعد کی ہزاروں تحریریں دیکھنے کے باوجود کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا اور قیاس غلط بھی ہو سکتا ہے۔ دوسری بات بھوپال سے متعلق کہی گئی ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر وہاں وہ قلمی نسخہ دریافت ہوا تھا جس پر نسخہ حمیدیہ مبنی ہے تو وہیں وہ غزل بھی کہی گئی تھی جس کا اس مضمون کے شروع میں ذکر کیا گیا چنانچہ یہ نسبت بھی کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے کوئی قطعی دلیل نہیں ہو سکتی۔

دوسرا اقتباس اس دیوان کے پاکستانی ایڈیشن کے مقدمہ نگار کے مراسلہ کا ہے۔ اور تیسرا اس دیوان کے مالک ثانی حافظ توفیق احمد چشتی امروہوی کے خط کا ہے۔ اس سلسلے میں صرف اتنی بات عرض کرنی ہے کہ میرے نزدیک وہ جعل جعل ہی نہیں جو بادی النظر میں جعل معلوم ہونے لگے ایک کرم فرما نے مجھے لکھا کہ:

"اختلافات کے مقابلے میں شاید مشابہتیں زیادہ ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"

یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جعل بنائے گا تو اتنی بات کی تو وہ لازماً کوشش کرے گا کہ اس میں زیادہ سے زیادہ "مشابہتیں" پیدا کر دے، صرف وہ ایک آدھ نکتہ جو اس نگاہ سے چوک جائے گا اس کے جعل کا پردہ چاک کریگا۔ یہ توقع کرنا کہ اس میں مشابہتوں کے مقابلے میں اختلافات زیادہ ہوں گے اس جعل ساز کے "فن" کی توہین بھی ہے اور اپنی انتہائی سادگی بلکہ سادہ لوحی کی دلیل بھی۔

**بخطِ غالب ہونے کا واحد ثبوت:**

اس دعوے کی بنیاد کہ یہ نسخہ 'بخطِ غالب' ہے اس 'ترقیمے' پر ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

"بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز باقیماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ ز تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع بجناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آورد۔"

ایک صاحب نے یکم اگست ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں میرا مضمون دیکھ کر مجھے لکھا کہ:

"نسخہ بھوپال بخط غالب کو میں نے محض ترقیمے کی نوعیت کی بنا پر غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تسلیم کیا ہے۔"

ممکن ہے کہ ان کی بات پوری طور پر صحیح ہو لیکن عام طور پر ترقیمے کے صرف الفاظ کی بنا پر اس بات کو تسلیم کیا گیا اور اس کی نوعیت سے کما حقہٗ اب تک بحث نہیں کی گئی۔ ورنہ اس سلسلے میں کم از کم درج ذیل مسائل زیرِ غور آ سکتے تھے۔

۱۔ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دوسرے ترقیمے کس انداز کے ہیں؟ کیا ان کی عبارتوں سے یہ ترقیمہ مطابقت اور مماثلت رکھتا ہے؟

۲۔ اس دیوان کو "حسرت عنوان" کہنے کا سبب کیا ہوا ہوگا؟

۳۔ ترقیمے میں وقت، دن، تاریخ، مہینہ اور سنہ ہجری تک

(بقیہ ص ۹)

## مراسلات

# نسخۂ عرشی زادہ پر ایک اعتراض کی حقیقت

آخر ۱۹۶۳ء کی بات ہے میں نے "ضمیمۂ نسخۂ عرشی" عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں غالب کا وہ تمام غیر مدوّن اردو کلام یکجا کر دیا تھا جو نسخۂ عرشی کی طباعت کے بعد مختلف مآخذوں سے علم میں آیا تھا۔ یہ مضمون ہند و پاک دونوں جگہ کئی برس ہوئے شائع ہو چکا ہے۔

اس ضمیمے کے چار اندراجات ایسے تھے جن کے بارے میں طباعت ضمیمہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا انتساب غالب کی طرف غلط ہے۔ ان چاروں سے متعلق کتاب خانۂ رام پور میں داخل کردہ ضمیمے کی کاپی پر میں نے بطور یادداشت اصلاحی نوٹ لکھ دیے تھے۔ اور غلط منسوب کلام اور اس سے متعلقہ اپنی اوّلین حواشی کو قلمزد کر دیا تھا۔ اصلاحی یادداشتیں درج ذیل کرتا ہوں۔

الف

اے اہل بزم کوئی تو بولو خدا لگی

یہ مصرع لطائف غیبی کے حوالے سے ضمیمے میں نقل ہوا تھا۔ میں نے اسے قلمزد کر کے یہ نوٹ لکھا:

"یہ میر محمدی بیدار کا مصرع ہے دیکھئے دیوان بیدار طبع الہ آباد ص ۱۰۹۔
اس کا مصرع اولیٰ یہ ہے۔
میں کیا کیا کہ مجھ کو نکالے ہے وہ صنم

ب

۱۔ شاہا تجھے بادولت و بخت فیروز الخ
۲۔ عید آئی ہے دل اہل زمانہ شاد ہے الخ
۳۔ گلشن دہر میں بسنت آئی الخ

یہ ایک رباعی اور دو قطعے جناب نثار احمد فاروقی نے ہماری زبان ۱۵ر مارچ ۶۲ء میں عیدی نامہ کے حوالے سے شائع کرائے تھے۔ وہیں سے میں نے ضمیمے میں نقل کئے۔ بعد ازاں رباعی کو قلمزد کر کے یہ نوٹ لکھا:

"یہ رباعی ذوق کے دیوان مطبوعہ نولکشور میں موجود ہے۔"

چونکہ ایک انتساب اسی کتاب کے مرتب کا غلط ہو چکا تھا اور بقیہ دو کو بھی غالب کا تسلیم کرنے کے لئے کوئی قرینہ قیاس یا دلیل موجود نہ تھی اس لئے ان دونوں کو بھی میں نے قلمزد کر دیا اور یہ نوٹ لکھا:

"یہ بھی اب میری رائے میں غالب کے نہیں ہو سکتے اور اس لئے خارج کئے جاتے ہیں۔"

ج

قاضی معراج دھولپوری صاحب نے ماہنامہ غالب آگرہ بابت جون جولائی ۶۹ء سے شیخ سعدی کی مشہور غزل:

سرو سیمینا بصحرا می روی

کا ایک اردو مخمس ہماری زبان ۸ر اگست ۱۹۶۱ء میں تبرکات غالب کے تحت شائع کیا اور تضمین سے اردو مصرعوں کو ماہنامہ غالب آگرہ کے ایک مضمون نگار درد کاکوروی کے حوالے سے غالب کا قرار دیا اس انتساب کی بنیاد مخمس کے آخری بند کا یہ مصرع ہوگا:

جان جاں طبع اسد ہے نادرست

میں نے بھی ضمیمے میں غالب ہی کا سمجھ کر شامل کر لیا۔ بعد میں غلطی کا علم ہوا تو پچھلی تحریر قلمزد کرتے ہوئے یہ نوٹ میں نے لکھ دیا۔

"یہ تضمین محمد سلیمان اسد تخلص کی ہے۔ غالب و اسد کی نہیں ملاحظہ ہو۔ دیوان اسد موسومہ مطلع خورشید۔"

د

اسی طرح:

دل بیتاب کہ سینے میں دم چند رہا

بھی میں نے تبرکات غالب از قاضی معراج دھولپوری ہماری زبان یکم اگست ۶۱ء سے خمسے کی شکل میں نقل کی تھی۔ یہ خمسہ مضمون نگار کو باغ دہر نامی ایک قلمی مجموعے میں ملا تھا۔ باغ دہر میں خمسے کا عنوان یہ ہے: "خمسہ میاں ہدایت علی دغزل اسد" بعد میں شعرائے اردو کے تذکروں پر کام کرتے ہوئے گلشن ہمیشہ بہار کی بھی ایک ایک سطر پڑھنا پڑی اور اسی مطالعے کے دوران میں ایک ہی صورت سامنے آئی تو میں نے خمس کو قلمزد کیا اور یہ نوٹ لکھا:

"یہ غزل غالب کی نہیں۔ میر امانی شاگرد سودا کی ہے ملاحظہ ہو گلشن ہمیشہ بہار از نصر اللہ خاں خویشگی تحت ترجمہ شاعر مذکور صفحہ ۱۱"

گذشتہ سال دیوان غالب بخط غالب دریافت ہوا تو یہ غزل اس کے متن میں موجود تھی۔ دیوان کا بخط غالب ہونا اور اس پر بخط غالب اصلاحات کا اضافہ اتنا یقینی اور محکم تھا میں نے اپنے مذکورہ قبل نوٹ کو خارج کر کے دوسرا نوٹ یہ لکھا:

"خویشگی سے سہو ہوا ہے یہ غزل مرزا غالب ہی کی ہے اور ان کے خود نوشت قلمی دیوان میں موجود ہے۔"

ظاہر ہے کہ میرے علم میں دیوان کی دریافت سے پہلے یہ آچکا تھا کہ خوشگی نے اس غزل کو میر امانی اسدؔ کا قرار دیا ہے اس طرح دیوان زیر بحث کو بھی بخطِ غالب قرار دیتے ہوئے جانچ پڑتال کے وقت وہ شبہ جو میرے بھی ذہن میں آیا اور اس کا ذہن میں آنا قدرتی بات ہے جو صاحب نقوم اسلاف نگار جناب انصار اللہ نظر نے گذشتہ ہماری زبان میں ظاہر فرمایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جہاں میرے علم میں یہ امر ہے کہ بعض دواوین میں الحاقی کلام پایا جاتا ہے وہیں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کچھ غلط روایات نے بھی بہت سے اشعار کو آوارہ گرد بنا دیا ہے۔ مثلاً نظامی بدایونی نے دیوان شیفتہ کے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"۱۸۴۷ء کا وہ زمانہ تھا کہ نواب صاحب (شیفتہ) و مفتی صاحب (آزردہ) کے یہاں ہر ہفتے باری باری سے مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک روز نواب صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا اس میں مفتی صاحب نے اپنی وہ مشہور غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا لاکے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

نواب صاحب نے مزاحاً مفتی صاحب کے چھیڑنے کو اسی طرح میں ایک غزل ایسے شخص کو لکھ کر دے دی جس کا شمار سخنوران مشاہیر میں نہ تھا۔ مفتی صاحب کے بعد جس وقت اس نے اس غزل کو پڑھا مفتی صاحب کی گھبراہٹ اور پریشانی قابلِ دید تھی اس غزل کے دو شعر یہ ہیں:

ہم بزمیٔ دشمن کا چھپانا ہی تھا قاصد
کہتا ہے کسی سے کوئی نادان خبر ایسی

کیجئے جو علاج آپ کریں کچھ خفقاں کا
دل کانپ کو رہوے گا سنائی اگر ایسی"

حقیقت حال یہ ہے کہ آزردہ سے منسوب شعر آزردہ کے ایک شاگرد مہتاب رائے تاب تخلص کا ہے جسے خود آزردہ نے اپنے تذکرۂ شعرائے ریختہ میں تاب کے ترجمے میں نقل کیا ہے۔ تو معاملہ صرف غلط انتسابات ہی کا نہیں ہے غلط واقعات گڑھ لینے کا بھی ہے۔ ایسے مواقع پر انصار اللہ صاحب جیسے صاحب نظر کا رویہ عام رویے سے مختلف اور محتاط ہونا متوقع ہے یعنی یہ کہ اعتراض سے پہلے دو روایتوں میں یہ بھی طے کر لیا جائے کہ باوزن روایت کونسی ہو سکتی ہے۔

یعنی اگر کسی تذکرے میں غالب کی کوئی غزل کسی دوسرے شاعر کے نام پر درج ہے لیکن اس تذکرہ نگار کے مقابلے میں زیادہ مضبوط شواہد یہ بتاتے ہیں کہ تذکرے کا انتساب کسی سہو کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے تو اعتراض کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

میں نے یا کسی دوسرے نے جو اصل مخطوطے کو دیکھ چکا ہے کوئی بیان دیا تو جذباتی انداز میں نہیں دے دیا۔ اگر زیر بحث دیوان خوشگی کے ایک بیان کی بنیاد پر ناقابل اعتبار قرار دیا گیا اور اس کے متن کی ایک غزل و حاشیے کی ہوتی تو بھی صورت حال بدل جاتی، خوشگی کے اندراج کی بنیاد پر غالب کی سطح پاتی اور یہ اس صورت حال کے باوجود ہوا کہ تمام قرائن اس دیوان کو بخطِ غالب اور اصلاح کردہ غالب یقین کی حد تک بتاتے ہیں تو پھر میں عرض کروں گا کہ انصار اللہ نظر صاحب نے ایک غزل ہی پر کیوں اکتفا کیا غالب کا سارا دیوان دیا کم از کم وہ کلام جس میں اسدؔ تخلص آیا ہے) بھی میر امانی اسدؔ کے حساب میں کیوں نہ شمار کر لیا اور کیا عجب جو اس سلسلے کا آئندہ اقدام یہی ہو۔

• رامپور　　　　• اکبر علی خاں عرشی زادہ

له اسی علم کی بنیاد پر والد مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی طبع دوم کے حصۂ سوم یادگار نالہ میں اسے شریک نہیں فرمایا تھا لیکن دریافت دیوان کے بعد نسخۂ عرشی کے حصۂ چہارم یاد آورد کے تحت اسے درج کیا۔ اس علم کی بنیاد پر جناب ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کو مدت ہوئی اطلاع دی گئی تھی کہ فلاں فلاں مندرجات نسخۂ عرشی اور ضمیمہ نسخۂ عرشی میں غالب سے غلط منسوب ہوئے ہیں اور آپ انھیں شرح میں شامل نہ فرمائیں۔ ان میں اس غزل کا بھی مذکور تھا۔

خوشگی کا تذکرہ غالب کی نظر سے گزرا یا نہیں اس بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن　　　گزرا تو بھی غالب سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ وہ اس غزل کو میر امانی اسد سے منسوب کئے جانے پر کوئی احتجاج کریں گے اس لئے کہ اپنے رد کردہ کلام کے بارے میں ان کا رویہ اور انداز فکر یہ ہے:

"امید کہ سخن سرایانِ سخنور ستائی پراگندہ ابیاتے راکہ خارج ازیں اوراق یابند از آثار تراوش رگ کلک این نامہ سیاہ نشناسند و جامع گرد آورد اوراق را بستایش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نگارند" (دیباچہ دیوان اردو)

ظاہر ہے غالب کی اس معذرت اور برأت کے بعد ان سے کسی تصحیح کی توقع بھی سادہ لوحی ہوگی۔

## دیوانِ غالب بخطِ غالب کا نام دیوانِ عرشی زادہ کیوں؟

ہماری زبان (یکم ستمبر) میں اکبر علی خاں عرشی زادہ کا عالمانہ مضمون "مخطوطہ گل رعنا بخط غالب" بہت مفید اور معلومات افزا ہے اور غالبیات کے سلسلے میں اس سے قیمتی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر

مجھے ان کے اس مضمون سے ایک منطقی مغالطہ پیدا ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ وہ اس کی وضاحت فرما کر مجھے شکر گزار کریں گے۔

مضمون نگار نے گل رعنا کے پہلے قلمی نسخے کا نام "نسخۂ حسرت" تجویز کیا ہے اس لئے کہ یہ حسرت موہانی کی ملکیت تھا۔ دوسرے قلمی نسخے کو وہ "نسخۂ بلگرامی" کہتے ہیں کیونکہ اسے نقی بلگرامی صاحب نے مالک رام صاحب کو دیا تھا اور یہی مالک رام کے مرتبہ "نسخۂ گل رعنا" کی بنیاد ہے) تیسرا "نسخۂ سویدا" ہے جو حکیم نبی احمد خاں جمال سویدا (لاہور) کی ملکیت ہے۔ چوتھا "نسخۂ خواجہ" بھی خواجہ محمد حسن (لاہور) کے کتب خانے میں ہے۔ گویا چاروں نسخے اپنے اپنے مالکوں سے منسوب ہوئے ہیں۔ لیکن اسی مضمون میں انھوں نے دیوان غالب کے اس نسخے کو جو امروہہ کے ایک کتب فروش نے بھوپال سے حاصل کیا تھا، یہ لکھا ہے کہ "نسخۂ عرشی زادہ" کے نام سے مرتب اور شائع ہوا۔" اگر نسخے کا نام ملکیت کے اعتبار سے رکھنا تھا تو اسے نسخۂ توفیق (امروہہ) یا نسخۂ شفیق (بھوپال) کیوں نہیں کہا گیا اور اگر یہ رعایت تھی کہ اسے ترتیب دینے والے اور چھاپنے والے اکبر علی خاں صاحب ہیں تو گل رعنا کے نسخۂ دوم کو "نسخۂ مالک رام" کیوں نہیں کہا؟

دوسری بات یہ کہ "گل رعنا" علمی مجلس دلّی نے مئی ۱۹۷۰ء میں شائع کی ہے اور اس سے پہلے دسمبر ۱۹۶۹ء میں ادارہ تحقیقات پاکستان پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے پروفیسر وزیر الحسن عابدی اس کا متن تفصیلی مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ایڈٹ کر چکے ہیں جو بڑے سائز کے ۴۰۵ صفحات پر ٹائپ میں شائع ہوا ہے (سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۷)۔ اس کا ذکر اکبر علی خاں نے سرے سے نہیں کیا۔ یہ ممکن نہیں کہ انھیں مالک رام کے مرتبہ نسخے کا علم ہو اور اس سے پہلے شائع ہونے والی کتاب کا نہ ہو۔

شاہ جہاں پور • اقتدار حسین خاں

## نو دریافت دیوان غالب کا بخط غالب ہونا مشتبہ

ہفتہ وار "ہماری زبان" کا ۱۵ر ستمبر کا پرچہ دیکھا دیوان غالب کے نسخۂ بھوپال ثانی کی دریافت اور تشہیر جس دھوم دھام سے ہوئی تھی اب جبکہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب نے اس کا جعلی اور نقلی ہونا ثابت کر دیا ہے لازم ہے کہ اس "انکشاف" کا بھی اسی فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا جائے۔

حقیقت ہے کہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب کی اس تحقیق نے پوری اردو دنیا پر احسان عظیم کیا ہے اور یہ تلخ حقیقت روز روشن کی طرح نمایاں ہو گئی ہے کہ ہم نہ غالب کے انداز خط سے واقف ہیں نہ اس کے انداز بیان سے اور ہم کو بڑے سے بڑا دھوکا بھی دیا جا سکتا ہے۔

میری درخواست ہے کہ اب ڈاکٹر صاحب نسخۂ بھوپال ثانی سے متعلق اپنی تمام تحقیقات کو ایک مسلسل و مفصل مضمون کی صورت میں از سر نو مرتب کر دیں۔

ایک بات جو مجھے اس سلسلے میں کھٹکتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک انیس سال کا نو عمر لڑکا (خواہ وہ آئندہ کتنا ہی بڑا منفرد طباع و مجدد کیوں نہ ثابت ہو) ایسے اشعار کیونکر کہہ سکتا ہے جیسے کہ اس نو دریافت نسخے میں پائے جاتے ہیں۔ انگلینڈ کے شیکسپیئر اور ہندوستان کے مفکر اعظم کے طفلانہ ماحول کو نظر انداز کر دینا فطرت انسانی کی توہین ہے۔ ہم کو عصر جدید میں آکر پیغمبرانہ معجزات کی بحثوں سے دامن بچانا پڑیگا جس میں کسی انسان کو گہوارہ طفل میں متکلم قرار دیا جا سکتا ہے۔

ریوا • لطیف احمد

صفحہ ۶ سے آگے

لکھا ہوا ہے لیکن صرف "سنہ" کے اوپر اعداد نہیں لکھے ہیں کیوں؟

۴۔ مخطوطے میں اصلاحیں بھی ہیں جو اس بات کی مظہر ہیں کہ کاتب نے اس پر نظر ثانی بھی کی، اس کے باوجود "سنہ" کے اعداد نہیں لکھے۔ کیا یہ اعداد اس نے صرف اس لئے نہیں لکھے کہ بعد میں "تقویم دیکھ کر" اس نسخے کے مویدین کوئی "مناسب" "سنہ تجویز کر لیں گے؟

یہ بات نہایت طمانیت بخش ہے کہ میرے یکم اگست ۱۹۷۰ء کے مراسلے کے بعد بھوپال کے سید حامد حسین صاحب نے پہلی مرتبہ تعصبات سے بالاتر ہو کر مسئلہ پر غور کیا۔ ترقیمہ میں سنہ کتابت کے محذوف ہونے کی بابت بحث کرتے ہوئے موصوف جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے:

"نامکمل سنہ کاتب کی ایک ایسی مخصوص ذہنی کیفیت اور کاروباری مصلحت کی جانب نشاندہی کرتا ہے جس سے خود مصنف اکثر مستثنیٰ رہتا ہے۔ چنانچہ عام حالات میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ خود مصنف کو مکمل تاریخ کتابت لکھنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے...

... اس دیوان کا دیا ترقیمہ جو محققین کی نظر میں اسے غالب کا قلمی ثابت کرتا ہے اس کے برخلاف بھی شہادت پیش کرتا ہے۔"

(ہماری زبان مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۰ء)

سہو و خطا سے کوئی خالی نہیں، بفرض محال اگر یہ تسلیم کر لیں کہ ابتداءً محض سہواً سنہ کے عدد لکھنے سے رہ گئے تھے تو نظر ثانی میں اس سہو کی درستی ممکن تھی، نظر ثانی کے بعد بھی سنہ کے اعداد کا نہ لکھنا سید حامد حسین صاحب کے شبہ کو ایک حد تک یقین کی صورت میں بدل دینے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح "بخط غالب" ہونے کا یہ واحد اور بنیادی ثبوت بجائے خود محتاج ثبوت ہو جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

## اخبار و اذکار

# یوم ادیب

بزم غالب ملکہ کے زیر اہتمام مولانا شاہ ابوالحسن ادیب مرحوم کی دسویں سالانہ برسی کے سلسلے میں "یوم ادیب" منایا گیا جس کی صدارت پروفیسر سید احمد شاکر (صدر شعبۂ اردو فارسی گورنمنٹ کالج نکور) نے کی۔ پروفیسر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا۔

"مولانا شاہ ابوالحسن ادیب مرحوم جنوب کی ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ زبان پر ان کو پوری قدرت حاصل تھی ریاست کے اردو داں میں صحیح اردو بولنے اور لکھنے کا شعور پیدا کیا تھا۔ جو کچھ بھی لکھا ہے خوب لکھا ہے سلاست، برجستگی، شوخی اور لطافت میں وہ فن کے امام تھے۔ ایسے فنکار کی یاد منانا انھیں خراج عقیدت پیش کرنا زبان و ادب کی خدمت کے مترادف ہے۔

مولانا ادیب مرحوم کے سب سے چھوٹے صاحب زادے جناب نجم الحسن انجم ادیب صاحب نے مولانا سے متعلق ایک مضمون "مولانا ادیب کے فارسی قصیدے" پڑھا اور مولانا ادیب مرحوم کی کچھ غزلیں بھی سنائیں۔

• ایس۔ ایم۔ اے۔ جلیل سکریٹری

# شعر، غیر شعر اور نثر پر مذاکرہ

گورکھپور:۔ گورکھپور کی نئی ادبی انجمن "پنج آہنگ" کے زیر اہتمام شمس الرحمٰن فاروقی کے طویل مقالہ "شعر، غیر شعر اور نثر" مطبوعہ شب خون شمارہ ۱۵، پر ایک مذاکرہ ہوا۔ سب سے پہلے افغان اللہ خاں نے اس مقالہ کے اہم حصوں کو پڑھ کر سنایا۔

اس کے بعد بحث کا آغاز کرتے ہوئے مرغوب حسن نے کہا کہ جس طرح حالی نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ہونے والی شاعری کے لئے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر ایک نظریۂ شعر فراہم کیا، اسی طرح فاروقی صاحب نے اس مقالہ کے ذریعہ نئی شاعری کو ایک نظریۂ شعر عطا کیا ہے۔

جالب نعمانی نے کہا کہ مجھے اس مقالے کی اہمیت سے انکار نہیں میں اسے اردو انتقادیات میں ایک اہم اضافہ سمجھتا ہوں لیکن وزن اور آہنگ کے سلسلے میں فاروقی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مجھے ان سے اتفاق نہیں۔ اگر احمد ہمیش کی نثری نظموں کو بھی شاعری کے دائرہ میں شامل کر لیا جائے تو شعر اور نثر کا فرق ہی ختم ہو جائے گا۔

رضوان اللہ نے جالب نعمانی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے نثری نظموں میں آہنگ کی موجودگی کو تسلیم کیا اور اسے وزن کا بدل قرار دیا۔ افغان اللہ خاں نے فاروقی صاحب کے بیان کردہ شعر کے امتیاز کی پہچان یعنی موزونیت، اجمال الفاظ کا جدلیاتی استعمال اور ابہام کے اصولوں کی تائید کی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ذوق سلیم کے بغیر یہ معروضی اصول بھی شعر اور غیر شعر کے امتیاز میں معاون نہیں ہو سکتے۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر اختر باری نے مقالہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ مقالہ اردو شعریات (POETICS) میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور شاعری اور نثر کی پہچان کے لئے ایک معروضی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ انھوں نے آہنگ اور ذوق سے متعلق اٹھائے گئے سوالات کا جواب دیتے ہوئے فاروقی صاحب کے خیال کی تائید کی۔

• افغان اللہ خاں

# جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا مراسلہ

حیدرآباد:۔ جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد عمومی انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش نے حسب ذیل بیان جاری کیا ہے:

آندھرا پردیش کے متعدد اضلاع سے یہ شکایات آ رہی ہیں کہ اردو میڈیم مدارس کو حسب ضرورت اساتذہ میسر نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ہر سال ان میں سے اکثر مدارس کے نتائج انتہائی خراب ہوتے ہیں۔ انجمن اس بارے میں محکمہ تعلیمات سے مناسب نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ انجمن کے پاس صحیح اور مکمل مواد موجود ہو۔ لہٰذا انجمن کی شاخوں اور دوسرے ہمدردوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ دفتر انجمن

واقع اردو ہال، حیدر گوڑہ، حیدر آباد پر مفصل معلومات روانہ کریں تاکہ ان کی بنا پر کارروائی کی جاسکے۔ محض شکایات روانہ کر دینا کافی نہیں ہے۔

• نامہ نگار

## پٹیالہ میں ادبی نشست

گذشتہ شب پٹیالہ کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر جناب راج دیوانہ کی رہائش گاہ پر ایک عظیم الشان ادبی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت پنجاب کے نامور صاحب دیوان شاعر جناب لبھّو کپور رشقوی نے فرمائی اور اسٹیج سکریٹری کے فرائض جناب جوہر بھارتی نے انجام دئے۔

اس نشست میں پنجاب و ہریانہ کے مستند شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

• راج دیوانہ

صفحہ ۱۲ سے آگے

گھٹن لگا دیں گی۔ گو سول ژے نٹ سن اپنے سماجی نظام کے ہرگز خلاف نہیں ہے، مگر وہ اس احتساب کے ضرور خلاف ہے جو حریتِ فکر کو کسی طرح گوارا نہیں کرتا اور ادیبوں کو سیاست دانوں کی بنائی ہوئی لکیر کا فقیر بنا دینا چاہتا ہے۔ انقلاب کے بعد جو روسی ادیب اور شاعر ادبی دنیا میں ممتاز ہوئے ان میں مایا کوسکی، شولوخف، پاسترناک، ایلیا ایرن برگ، سول ژے نٹ سن اور یودو شنکو کا نام ضرور آئے گا۔ ایلیا ایرن برگ کا وہ درجہ نہیں شولوخف کا ہے۔ اور ایرن برگ بھی کسی نہ کسی طرح اپنے یہاں کے احتساب کی مذمت کرتا رہتا تھا، شولوخف نے ایک طویل عرصے تک کچھ نہیں لکھا۔ پاسترناک شاعری اور ترجموں میں لگا رہا اور جب آخر عمر میں اس کا ناول ڈاکٹر ژواگو شائع ہوا تو روس میں مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مایا کوسکی نے خودکشی کر لی۔ سول ژے نٹ سن یقیناً صدر اول کا فن کار ہے مگر روس کے سرکاری حلقے اس کے اس اعزاز کو صرف سیاسی چال اور روس دشمنی کی ایک اور مثال قرار دے رہے ہیں۔ نوبل انعام ہمیشہ ادیب کی عظمت کا ضامن نہیں ہوتا پرل بک جیسی تیسرے درجے کی لکھنے والی اور اسٹائن بیک جیسے دوسرے درجے کے فنکار کو یہ انعام مل چکا ہے اور بعض صدر اول کے ادیبوں کا نوبل کمیٹی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نوبل کمیٹی والے ہر دفعہ خالص ادبی معیار نہ دیکھتے ہوں بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے متاثر ہو جاتے ہوں ایک امریکی ناولسٹ

اروِنگ والیس نے (THE PRIZE) میں وہاں کی سازشوں کا پردہ بھی فاش کیا ہے، پھر بھی ہمارا خیال یہ ہے کہ سول ژے نٹ سن ہر طرح اس انعام کا مستحق ہے۔ وہ اس وقت روس کے ہی نہیں دنیا کے ممتاز ناول نگاروں میں سے ہے اور اس کے اعزاز پر مخالفت کا طوفان کھڑا کرنا وقتی سیاسی مصالح کو ادبی قدروں پر ترجیح دینا ہے۔ ہر ایماندار ادیب کبھی کبھی جس سے محبت کرتا ہے اس سے لڑتا بھی ہے۔

رابرٹ فراسٹ نے کہا تھا کہ میرا اور دنیا کا جھگڑا دو پریمیوں کا جھگڑا ہے۔ سول ژے نٹ سن کا روس کے سرکاری حلقوں سے اختلاف بھی ایک پریمی کا جھگڑا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ انقلاب دشمن اور روس دشمن نہیں ہو جاتا۔ اس نے سویڈن جاکر انعام لینے کا ارادہ تو ظاہر کیا ہے مگر دیکھنا ہے کہ اسے اس کی اجازت بھی ملتی ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ روس کے سرکاری حلقے اسے سویڈن جاکر یہ انعام لینے کی سہولتیں دیں گے۔

▲

## کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

### مزاج آب و گل (مجموعہ کلام)

مصنف: حسن شہیر
ناشر: گلستان آرٹ اکاڈمی، بارہ بنکی
صفحات: ۲۴۴ قیمت ۷ روپے

### بنگال کا اردو ادب (انیسویں صدی میں)

مصنف: پروفیسر جاوید نہال
ناشر: اردو رائٹرس گلڈ۔ کلکتہ
صفحات: ۱۲۱ قیمت ۱۵ روپے

### آثار مخدوم

مرتب: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ناشر: مکتبہ جامعہ دہلی
صفحات: ۲۶۸

### دیوان شاغل

مصنف: احترام الدین احمد شاغل
ناشر: محمد احتشام الدین عثمانی گھاٹ گیٹ تسلیم منزل بجے پور۔
صفحات: ۱۶۸

آل احمد سرور

# میرا صفحہ

پچھلے سال کا نوبل انعام سموئیل بیکٹ کو ملا تھا جو لامعقولیت کے اسکول (THEATRE OF THE ABSORD) کا امام کہا جاتا ہے۔ امسال کا نوبل انعام الیگزینڈر سولزے نٹسن کو ملا ہے جسے اس دور کا داستووسکی کہا گیا ہے۔

گزشتہ بارہ سال میں تین روسی مصنفین کو نوبل انعام ملے ہیں۔ یہ روسی ادب کی عالمی اپیل اور گہرائی کی دلیل ہے۔ ۱۹۵۸ء میں بورس پاسترناک کو اس کے ناول ڈاکٹر ژواگو پر انعام دیا گیا۔ اس انعام کے خلاف روس میں اتنا احتجاج ہوا اور پاسترناک پر اس طرح دباؤ ڈالا گیا کہ غریب نے انعام لینے سویڈن جانے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر ژواگو یقیناً فن کا ایک گراں قدر نمونہ ہے۔ پاسترناک دراصل ایک شاعر ہے اور اس کی ناول بھی بڑی شعریت رکھتی ہے۔ وہ انقلاب کے خلاف نہیں، مگر اس کے اندر کا فنکار یہ دکھائے بغیر نہیں رہتا کہ انقلاب کے اسٹیم رولر نے افراد کے جذبات کو کس طرح نظر انداز کیا ہے۔ یوری اور لارا کا کردار پاسترناک نے اس چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ ان کے سوز و ساز کی آنچ ہر پڑھنے والا محسوس کر سکتا ہے۔ روس کے سرکاری حلقوں کو اس ناول میں روس اور انقلاب دشمنی نظر آئی، دنیا نے اسے تصویر کے دوسرے رخ کی حیثیت سے دیکھا جو اپنے اندر بڑی جان رکھتا ہے۔

اس کے بعد نوبل کمیٹی نے شولوخوف کو انعام دیا۔ "اور ڈان بہتا رہا" کا یہ شہرۂ آفاق مصنف ایک عرصے تک خاموش رہا۔ بہت دن بعد ایک چھوٹا سا ناول لکھا، مگر اس کے شروع کے ناولوں میں ڈان کی وادی اور انقلاب روس کی جو جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے اس کی ادبی اہمیت مسلّم ہے۔ خصوصاً ڈان دریا میں تو ایک شخصیت، ایک روح پیدا ہو گئی تھی۔ چونکہ شولوخوف نے اسٹالن یا سرکاری حلقوں کے خلاف کبھی آواز نہیں اٹھائی، ہاں اس کی خاص طویل خاموشی معنی خیز ضرور تھی۔ اس لئے جب اسے انعام ملا تو روس میں اس کے انعام پر کوئی مخالفت نہیں ہوئی۔

اب کہ جب سولزے نٹسن کو انعام ملا ہے تو ابھی سے روس کے سرکاری حلقوں میں اس انعام کی مخالفت شروع ہو گئی ہے۔ اسے سرد جنگ کا ایک اور مظاہرہ قرار دیا جا رہا ہے اور چونکہ سولزے نٹسن کے پہلے ناول 'ایوان ایوانوف کی زندگی میں ایک دن' کے علاوہ جو روس میں چھپا تھا، اس کے بعد کے دو ناول کینسر وارڈ (CANCER WORD) اور (THE FIRST CIRCLE) باہر چھپے اور فوراً اتنے مقبول ہوئے کہ دنیا کی کئی زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو گیا، اور چونکہ سولزے نٹسن نے پچھلے سال کچھ ادیبوں پر مقدمہ چلانے کے سلسلے میں احتجاج کیا تھا اور اسے روسی ادیبوں کی کانگریس سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اس لئے اب اس کے نوبل انعام کو روس کے سرکاری ادیب، روس کے ساتھ زیادتی سمجھتے ہیں حالانکہ سولزے نٹسن ایک کمیونسٹ ادیب ہے۔ وہ دراصل اسٹالن اور اسٹالنزم کے کڑے احتساب کے خلاف ہے۔ اس نے دوسری جنگ عظیم میں کارہائے نمایاں انجام دئے اور اسے ایک پرائیویٹ سے کپتان بنایا گیا مگر چونکہ اس نے اپنے کسی دوست کو ایک خط میں اسٹالن پر نکتہ چینی کی تھی اس لئے اسے آٹھ سال کے لئے قید کر دیا گیا۔ اس قید کی زندگی کو اس نے اپنے پہلے ناول 'ایوان ایوانوف کی زندگی میں ایک دن' کے ذریعہ سے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ قیدی کا ایک دن، پہرہ داروں کی کڑی نگاہوں سے بچ جانے اور شوربے کا ایک دوپیالہ حاصل کرنے سے عبارت ہوتا ہے۔ خروشچیف کے زمانے میں روس کی ادبی زندگی کی برف کچھ پگھلنے لگی تھی اور اسٹالن کے خلاف خود خروشچیف بہت کچھ کہہ چکا تھا، اس لئے یہ ناول شائع ہو گیا۔ مشہور مارکسی نقاد جارج لوکس (GEORGE LUCAKS) نے اسے جیمس جوائس کے یولی سیز (ULYSES) پر ترجیح دی ہے اور اس کی حقیقت نگاری کو معنی خیز حقیقت نگاری کی ایک اہم مثال قرار دیا ہے۔ اس کے دوسرے ناولوں میں بھی دراصل انقلاب کے خلاف نہیں، اس احتساب کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے جو حریت فکر کو قطعی گوارا نہیں کرتا اور مختلف ذرائع سے ذہنی آزادی کو کچلتا رہتا ہے۔ سولزے نٹسن نے روسی ادیبوں کی انجمن کو جو خط لکھا تھا اس میں ادیب کی آزادی پر زور دیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے پتے کی بات یہ کہی تھی کہ اگر معاشرہ میں کچھ خرابیاں نظر آئیں تو انھیں سامنے لانا چاہئے ورنہ وہ اندر اندر سرایت کر کے پورے سماج کو

(باقی صفحہ [illegible])

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپا کر دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 922 فون نمبر ۲۹ R.N.A. 2186/57